یورپ اور امریکہ کی اُردو غزل

ڈاکٹر جواز جعفری، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، ایم۔اے۔او کالج، لاہور

Abstract

In this article, it is presented that urdu ghazal is written with high creative sensibility in Europe and America. These poets have their personal images and themes in their verses.

ایک زمانہ تھا جب اُردو صرف ہندوستان میں بولی جاتی تھی۔ پاکستان بنا تو اس کی دوسری دُنیا بھی وجود میں آ گئی مگر اُس وقت اُردو کی اثر پذیری کا یہ عالم ہے کہ یہ زبان برصغیر سے باہر کم از کم چار نئی بستیاں (برطانیہ، امریکہ، کینیڈا اور مشرقِ وسطیٰ) آباد کر چکی ہے اور ان بستیوں میں درجنوں کی تعداد میں اُردو زبان کے نقاد، شاعر، محققین، ناول و افسانہ نگار قیام پذیر ہیں اور ان ممالک سے ہر سال اُردو زبان کی درجنوں کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ ان کتابوں میں بیشتر شعری مجموعہ ہوتے ہیں اور شاعری میں غزل مقبول صنفِ سخن کے طور پر سامنے آئی ہے۔

مغرب میں آباد غزل گو شعراء کو بڑی آسانی سے دو طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے طبقے میں وہ غزل گو آتے ہیں جو بیرون ملک منتقل ہونے سے پہلے ادب میں مضبوط شناخت رکھتے تھے اور انڈو پاک کے علمی و ادبی حلقے ان کے فکری نتائج سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ ایسے غزل گوؤں میں ساقی فاروقی (انگلینڈ) احمد مشتاق (امریکہ) اور بخش لائلپوری (انگلینڈ) جیسے تخلیق کار شامل کیے جا سکتے ہیں۔ جبکہ دوسرے گروہ میں وہ غزل گو آتے ہیں جو بیرون ملک منتقل ہونے سے قبل تخلیقی عمل سے وابستہ تو ہو چکے تھے اور ادبی حلقوں میں بطور شاعر ان کا تعارف بھی موجود تھا لیکن ان کی تخلیقی شناخت میں استحکام بیرون ملک منتقلی کے بعد ہی دیکھنے میں آیا۔ ایسے غزل گوؤں میں اشفاق حسین (کینیڈا) عدیم ہاشمی مرحوم (امریکہ)، افتخار نسیم (امریکہ) انجم خیالی (انگلینڈ) عاشور کاظمی (انگلینڈ) اور آفتاب حسین (آسٹریا) کے نام خاصے اہم ہیں۔

مغرب میں مقیم آباد کاروں کے شعری حلقوں میں بھی دو طرح کے غزل گو نظر آتے ہیں۔ ایک قسم کے شاعر تو وہ ہیں جو عمر کے اس حصے میں بیرون ملک منتقل ہوئے جب زندگی کے بارے میں ان کے تجربات اور ذاتی نظریات پختہ ہو چکے تھے اور بڑی حد تک ان کے تخلیقی اسلوب کے نمایاں خدوخال بھی سامنے آ چکے تھے۔ ایسے غزل گوؤں نے غزل کہتے ہوئے پرانے اور آزمائے ہوئے تجربوں پر ہی اکتفا کیا اور ارادی یا غیر ارادی طور پر مغربی معاشروں اور اُن کے طرزِ احساس کی طرف ذہنوں کی کھڑکیاں بند کیے رکھیں۔ ان شعراء کی شاعری سے قاری کو کہیں اشارہ تک نہیں ملتا کہ یہ شاعر جدید طرزِ احساس کے حامل معاشروں میں بیٹھے شاعری تخلیق کر رہے ہیں بلکہ ان کی غزل کے مطالعے سے یہی احساس ہوتا ہے کہ جسمانی طور پر تو یہ شعراء

اکیسویں صدی کے جدید طرزِ احساس سے معمور معاشروں میں آباد ہو چکے ہیں مگر ذہنی لحاظ سے وہ اپنے قدیم معاشروں ہی کے شہری ہیں۔ستم تو یہ ہے کہ ان شعراء نے مغرب کے نئے معاشروں میں گھُلنے ملنے کی کوئی شعوری کوشش بھی نہیں کی۔ یورپ ہمیشہ ہی سے نئے خیالات' نئے دبستانوں اور نئی تحریکوں کا گڑھ رہا ہے اور ان نظریات نے برصغیر سمیت دُنیا بھر کے علوم وفنون کو متاثر کیا۔ یورپی خیالات نے اتنے فاصلے سے برصغیر کی زبانوں اور ادبیات کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ بڑے بڑے قد آور ادیب بھی پیدا کیے اور اب تو اُردو کے شاعر براہِ راست یورپی اور دوسرے مغربی معاشروں میں سانس لے رہے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ان کی غزل اس جدید طرز احساس کی پیشکش سے محروم ہے۔ حالانکہ یہ مسلمہ اصول ہے کہ ایک حقیقی ادیب جہاں بھی رہتا ہے اس کی تخلیقات وہاں کی آب و ہوا سے لازمی طور پر کچھ نہ کچھ کسب فیض ضرور کرتی ہیں۔ نئے طرزِ احساس کے فقدان کے پس منظر میں کئی طرح کے نفسیاتی خوف' سہل پسندی اور نئے تجربوں اور مظاہر کو تخلیقی عمل کا حصہ بنانے کے لیے تخلیقی جوش اور صلاحیت کی کمی جیسے عوامل کارفرما ہو سکتے ہیں۔ ان شاعروں کے ہاں اسالیب' طرزِ احساس اور موضوعاتی سطح پر مغربی ادب اور معاشرے کے ساتھ کسی قسم کا کوئی اختلاط نظر نہیں آتا۔ اگرچہ بعض غزل گوؤں نے اپنے خول سے ذرا سا باہر نکلنے کی کوشش کی ہے مگر ان کے ہاں بھی خوف' تجربے کا اُدھوراپن' اس طرف بطور فیشن آنکلنے اور چونکا کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی خواہش زیادہ نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان شاعروں کے ہاں نیا معاشرہ پرانے معاشروں کا التباس' تخلیقی تجربات پرانے تجربوں کا تسلسل اور تازہ تخلیقات پرانے ادب ہی کی توسیع ہیں۔

سینئر نسل کے شعرا کی نسبت وہ شعراء جو نسبتاً جوانی کے عہد میں مغرب میں منتقل ہوئے انہوں نے قدرے حیرت اور تجسس کے ساتھ مغربی معاشروں کو دیکھا اور کسی حد تک یہاں کی زندگی کو سمجھنے اور برتنے کی کوشش بھی کی۔ نتیجتاً ان شعراء کی غزل (بڑی حد تک) نئے علوم وفنون' تجربات اور طرزِ احساس سے معاملہ کرتی دکھائی دیتی ہے۔ ان شعراء نے ایک طرف تو اپنی جڑوں سے اپنا رشتہ قائم رکھا اور دوسری طرف نئے معاشروں کی طرف بھی اپنے ذہنوں کے دریچے وا کیے۔ جس کے نتیجے میں اردو شاعری (بیرون برصغیر) ایک نئے طرز احساس سے پہلی بار آشنا ہوئی۔ یہ ثقافتی اختلاط منصور آفاق (انگلینڈ) ارشد لطیف (انگلینڈ) حفیظ جوہر (انگلینڈ) یشب تمنا (انگلینڈ)' عابد ودود (انگلینڈ) آفتاب حسین (آسٹریا)' اشفاق حسین (انگلینڈ)' افتی نسیم (امریکہ)' اکبر حیدرآبادی (انگلینڈ)' سہیل امجد (لیسٹر)' سلیم فگار (انگلینڈ) اور فیضان عارف (انگلینڈ) کے ہاں نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ ان شعراء سے ہٹ کر بھی کچھ اور شاعروں کے اشعار دیکھیے جن کی غزل نئے مغربی مظاہر کو قبولتی نظر آرہی ہے:

جس نے تعمیر کیا مجھ کو لہو ہاتھوں سے
خاک ہو جاؤں کہ وہ شخص بھی اب خاک میں ہے　　(خالد ملک ساحل۔ جرمنی)

اک دوجے کے مہماں تھے ہم
لیکن اپنے اپنے دن تھے[۲]　　(جاوید انور۔ آسٹریا)

قدم کہیں پہ ارادہ کہیں کا رکھتے ہیں
خلاء میں رہتے ہیں؟ منظر زمیں کا رکھتے ہیں　　(حسین عابد۔ فرینکفرٹ)

ہجرت مہاجروں کو جہاں لے کے آئی تھی
بستر نہیں بچھے تھے فقط چارپائی تھی۲۴ (راشدامین۔ برمنگھم)

رات کے مینار پر رکھوں کوئی مہتاب سر
روشنی کی اک کرن تو آنے والوں کو ملے (عاشور کاظمی۔لندن)

کیا مقدر ہے کہ تو بھی پاس بیٹھا ہے مرے
پھر بھی ڈستا ہے وہی احساس تنہائی مجھے (عزیزالحسن۔امریکہ)

مذکورہ بالا اشعار پڑھنے کے بعد قاری کو ایک طرح کے نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں گھٹن کی بجائے تازگی کا تاثر نمایاں ہے۔اس کی وجہ یہی ہے کہ ان میں سے بیشتر شعراء نے مغربی معاشروں کو نہ صرف تحیر کی آنکھ سے دیکھا بلکہ ان کے اثرات اور روایات کو کشادہ دلی سے قبول بھی کیا۔ ان میں سے بعض شعرا نے مغربی معاشروں میں مستقل قیام کی خاطر مقامی عورتوں سے شادیاں کیں، سینئر لوگوں کے مقابلے میں زیادہ روشن خیال اور تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے مغربی ادب کا مطالعہ بھی کیا اور کسی حد تک اس ادب کے اثر اب و اسالیب کو بھی قبول کیا۔ مغربی عورتوں کے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد اور یہاں مستقل طور پر بس جانے کی وجہ سے بھی ان شعراء کا مغرب سے عملی نوعیت کا تعلق رہا۔ ان سارے عوامل نے مل کر ان کی غزل پر جدید طرزِ احساس کے دروا کیے۔ اس اختلاط اور کشادہ دلی نے ان کی غزل کو ایک نئی توانائی بخشی۔ یہی وجہ ہے کہ سینئر نسل کے بیشتر غزل گوؤں کے مقابلے میں ان شعراء کی غزل میں ایک خاص قسم کا توازن نظر آتا ہے۔ ان غزل گوؤں کے ہاں پرانے تجربوں کے ساتھ ساتھ نئی وارداتوں کا اظہار بھی ہے مگر یہ تبدیلی غزل کے مجموعی مزاج اور تخلیقی تناظر کے حوالے سے معمولی کوششوں کا درجہ رکھتی ہے۔

مغرب کی اُردو غزل کا ایک بڑا حصہ اپنے موضوعات، لہجے، ڈکشن اور طرزِ احساس کے حوالے سے انیسویں صدی کی غزل ہی کی توسیع معلوم ہوتا ہے۔ دنیا کے جدید ترین معاشروں میں آباد ہو جانے کے باوجود غزل گوؤں کے ہاں تبدیلی کا ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ملتا۔ ایک بات تو طے ہے کہ ہر شاعر اپنی شاعری میں اپنی توفیق کے مطابق سیاسی و سماجی شعور کا اظہار کرتا ہے۔ وہ اپنے موضوع اور انفرادیت کے حوالے سے مکمل طور پر آزاد ہوتا ہے اور بقول احتشام حسین یہی وہ اختیار ہے جسے ہم ادیب کی آزادی کہہ سکتے ہیں۔ اسی آزادی کے استعمال ہی سے ادیب و شاعر کے انفرادی و اجتماعی شعور کا پتہ چلتا ہے۲۵ یہاں سوال یہ ہے کہ اگر یہ غزل گو نئے معاشروں کی ترجمانی کی صلاحیت ہی سے محروم ہیں تو پھر وہ غزل گوئی ترک کیوں نہیں کر دیتے؟ ظاہر ہے ادب میں ایسا کوئی قانون نہیں جس کی رُو سے کسی کو بُرا ادب تخلیق کرنے سے روکا جا سکے۔ میرے خیال میں بیرون ملک غزل سے اس والہانہ وابستگی کی بہت سی وجوہات میں سے ایک وجہ نفسیاتی نوعیت کی بھی ہے۔ دراصل غزل اس تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے جسے مغرب میں آباد تارکین وطن پیچھے چھوڑ آئے ہیں مگر ذہنی اور جذباتی لحاظ سے وہ اب بھی اسی تہذیب میں زندہ ہیں۔ مغربی تہذیب میں گھل مل جانے اور اسے اپنانے کے بجائے ہمارے شاعروں نے اس نئی تہذیب کو ایک حریف کے روپ میں دیکھا جو ان کی آبائی ثقافتوں کو مٹانے پر تلی ہوئی تھی۔ چنانچہ ان شاعروں نے نئی تہذیب کے قریب آنے کے بجائے اُلٹا تہذیبی تصادم کا رویہ اختیار کیا۔ جب تہذیبی تصادم کا مرحلہ آیا تو ان آباد کار غزل گوؤں کے سامنے شناخت کا سوال آن کھڑا

ہوا۔ یہی وہ سوال ہے جس نے ایک طرف تو شاعروں کو اپنے آبائی وطنوں کی طرف ذہنی مراجعت کا رستہ دکھایا اور انہوں نے نئی تہذیب سے دوستی کرنے کی بجائے اپنی پرانی ثقافتوں پر فخر اور وابستگی کا اظہار شروع کر دیا اور ایک تحیر آمیز گرمجوشی کے ساتھ نئی تہذیب کی طرف بڑھنے کی بجائے اُلٹا اپنے اندر سمٹنے لگے اور دوسری طرف نئے معاشروں میں آباد ہونے کے باوجود اُنہوں نے پرانی اور آبائی تہذیبوں کے تحفظ اور دفاع کا بیڑا بھی اٹھا لیا۔ برطانیہ میں تو بعض شہر ایسے بھی ہیں جہاں تارکین وطن نے آباد ہونے کی شعوری کوشش بھی کی اور یوں مغرب کے اندر کئی چھوٹے چھوٹے پاکستان اور ہندوستان وجود میں آ گئے۔ یہاں کے باشندوں کے گھر کا ماحول، لباس، کھانے، زبان، شادی بیاہ کی رسمیں، غم اور خوشی سے وابستہ ثقافتی مظاہر پاکستانی یا ہندوستانی ثقافت ہی کی توسیع تھے۔ گویا عملاً غزل نے بھی اس تہذیب کے مختلف مظاہر کا رس کشید کر کے اپنے شعروں میں محفوظ کر لیا تھا۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندو مسلم تہذیب اور غزل لازم وملزوم ہیں۔ بیرون ملک جب اپنی ثقافت کے وجو کو خطرے میں دیکھا تو تارکین وطن (بالخصوص غزل گو شعراء) اس کے تحفظ کے لیے آگے بڑھے اور یوں بیرون ملک غزل کو سینے سے لگانے کا عمل شروع ہوا۔ گویا غزل سے محبت آبائی ثقافت سے محبت کے مترادف قرار پائی۔۵

غزل کو ذریعہ اظہار بنانے والوں (بالخصوص سینئر نسل کے شعراء) کا ایک مسئلہ اور بھی تھا۔ چونکہ ان شاعروں نے نئے طرز احساس کے لیے دامن دل وا نہیں کیا تھا۔ اس لیے تخلیقی عمل کا حصہ بنانے کے لیے ان کے پاس کوئی نیا تجربہ یا کوئی نئی واردات بھی نہ تھی۔ لہٰذا وہ اپنے سابقہ تجربوں ہی کو دہرانے پر مجبور تھے جس کے لیے غزل ہی مناسب ترین فورم یا ذریعہ اظہار تھا۔ یوں غزل ان کے لیے ایک پناہ گاہ کے روپ میں سامنے آئی۔ بیشتر تارکین وطن غزل گو ایک طرف نئے معاشروں کے شہری بن جانے کے باوجود ان کے قریب نہ ہوئے اور دوسری طرف وہ غزل گو غزل کی برصغیری روایت سے بھی کٹ گئے اور یوں پاک و ہند میں غزل کے سلسلے میں ہونے والی پیش رفت ان کے سامنے نہ آ سکی۔ (پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کا کردار ذرا تاخیر سے شروع ہوا)۔ ان غزل گوؤں کا المیہ دہرا تھا۔ ان کے ہاں نہ تو مغربی طرز احساس راہ پا سکا اور نہ ہی ان کے آبائی معاشروں میں آنے والی فکری، علمی و ادبی اور سماجی تبدیلیاں ان کے تخلیقی تجربوں کا حصہ بن سکیں اور یوں بیرون ملک اردو غزل کا ایک بہت بڑا حصہ بہتی ندی کے بجائے ٹھہرے ہوئے جوہڑ میں تبدیل ہونے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ بیرون ملک آباد ساقی فاروقی اور احمد مشتاق جیسے شاعروں کی غزل میں بھی کسی قابل ذکر تبدیلی کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ نہ صرف یہ شاعر بیرون ملک منتقل ہونے سے پہلے اپنی غزل کا اسلوب وضع کر چکے تھے بلکہ ان کی ثقافتی تربیت بھی مکمل ہو چکی تھی اور یوں ان شاعروں کی روایت کا مطالعہ بھی پاک و ہند کی غزل کی روایت میں رہ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہاں یورپ و امریکہ میں آباد ان غزل گو شعراء کی غل پر نظر ڈالی جا رہی ہے جن کے ہاں مغربی طرز معاشرت کی ایک آدھ جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ تاہم ادب کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جس کے درمیان واضح لکیر کھینچی جا سکے۔

احمد مشتاق (امریکہ) ایک حیران کر دینے والا شاعر ہے۔ قیام پاکستان کے آس پاس کے زمانے میں انہوں نے جب غزل گوئی شروع کی تو ادبی منظر نامہ ان کے لہجے کی روشنی میں نہا گیا۔ ناصر کاظمی اور احمد مشاق تخلیقی منظر نامے پر ساتھ ساتھ طلوع ہوئے مگر دونوں میں فرق تخلیقی صلاحیت سے زیادہ میڈیا کی پذیرائی کا ہے۔ دونوں شاعروں کے درمیان ایک فرق وطن میں آباد رہنے اور پردیس میں جا بسنے کا بھی ہے۔ ایک اور نمایاں فرق احمد مشتاق اور ناصر کاظمی کے مشترکہ دوستوں کے رویوں کا

بھی ہے کہ انتظار حسین ہوں یا ڈاکٹر سہیل احمد خاں‘ عمر بھر ناصر کاظمی کے حوالے سے حق دوستی ادا کرتے رہے مگر احمد مشتاق کی غزل ان کے دوستوں کی توجہ سے قدرے محروم رہی۔ یہی وجہ ہے کہ احمد مشتاق کی شاعری مناسب طریقے سے اردو قارئین تک نہیں پہنچ پائی۔ ورنہ دیکھا جائے تو احمد مشتاق‘ ناصر کاظمی سے بہتر تخلیقی صلاحیت رکھنے والا شاعر ہے ناصر کاظمی کی غزل کا وہ اختصاصی پہلو جس نے اس کی غزل کو دیگر غزل گوؤں سے الگ کر دیا وہ قیام پاکستان کے بعد وجود میں آنے والے معاشرے کا وہ نیا طرز احساس ہے جسے ناصر نے بطور خاص اپنی غزل میں جگہ دی جبکہ احمد مشتاق امریکہ منتقل ہو جانے کے باوجود مغرب کے جدید طرز احساس کے لیے اپنی غزل کا دامن وا نہیں کر پائے۔ ان کی غزل جدید طرز احساس سے لاتعلقی کا رویہ اختیار کرتے ہوئے مشرق کے قدیم طرز احساس ہی پر تکیہ کیے ہوئے ہے۔

احمد مشتاق کی غزل کو کیسا ہونا چاہیے کی بجائے اگر ہم یہ دیکھیں کہ ان کی غزل کیسی ہے اور اس میں کیا کچھ موجود ہے تو یہ غزل ہمیں زیادہ مایوس نہیں کرتی۔ یہ غزل دل سے لے کر دماغ تک کی بنجر سرزمینوں کو سیراب کرتی ہے۔ یہ ایسی غزل ہے کہ ہمارے بیشتر غزل گو ایسی غزل گوئی کی صرف آرزو ہی کر سکتے ہیں۔ یہاں پھڑکتے ہوئے اشعار اور اُڑتے ہوئے مصرعوں کی تعداد ساقی فاروقی سے کہیں زیادہ ہے اور بھرتی کے اشعار کی تعداد بھی قدرے کم ہے۔ بھولے بسرے چہرے‘ دوستوں کے بچھڑنے اور محفلوں کے اجڑنے پر اشک فشانی‘ انسانی آزادیوں کا احترام‘ صحرا ہوتے ہوئے شاداب باغوں کا افسوس تخلیق کے رنگارنگ تماشے‘ دم توڑتی محبتیں‘ مایوسیوں سے جنم لیتی نئی امیدیں‘ ماضی کی یادیں اور گاؤں اور اس کے مضافات کے لازوال مناظر یہ سب عناصر مل کر احمد مشتاق کی غزل کی تعمیر میں حصہ لیتے ہیں۔ اس غزل کا عاشق‘ محبوب سے زیادہ حسن محبوب سے وابستگی کی طرف مائل نظر آتا ہے۔ یہ حسن جسمانی بھی ہے اور ذہنی بھی‘ خیالی بھی ہے اور زمینی بھی مگر وہ خاص بات جو احمد مشتاق کی غزل کو دیگر شعراء سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ شاعر حسن سے لطف اندوزی کے کسی بھی مرحلے پر اس کے انجام کی طرف سے لاتعلق نہیں رہتا بلکہ وہ حسن و جمال کے زوال پر افسردگی کا اظہار بھی کرتا ہے۔ احمد مشتاق کا یہ وہ اختصاص ہے جو اردو غزل کی پوری روایت میں کم کم ہی دکھائی دیتا ہے۔[۶] چند اشعار دیکھتے چلیے:

☆ دل فسردہ تو ہوا دیکھ کے اُس کو لیکن
عمر بھر کون جواں‘ کون حسین رہتا ہے

☆ اب کہاں دیکھنے والوں کو یقیں آئے گا
باغ جنت تھا‘ بدن خواب تھے بوسے تیرے

☆ خیر بدنام تو پہلے بھی بہت تھے لیکن
تجھ سے ملنا تھا کہ پر لگ گئے رُسوائی کو

☆ دل میں وہ شور نہ آنکھوں میں دَم رہتا ہے
اب تپ ہجر توقع سے بھی کم رہتا ہے

☆ کن مٹھیوں نے بیج بکھیرے زمین پر
کن بارشوں نے اس کو تماشا بنا دیا

ساقی فاروقی (انگلینڈ) اُردو غزل کا ممتاز ترین حوالہ ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ادبی دنیا میں ان کی شاعری سے زیادہ اُن کے تنقیدی مضامین کی دھوم ہے اور ان مضامین کا نمایاں ترین پہلو ان کا متنازعہ ہونا ہے۔ ان کی نثر میں ایک خاص طرح کا ''شر'' چھپا ہوتا ہے جسے وہ بڑی آسانی سے پھیلا کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ میرے نزدیک ''شر'' کی یہ دولت ہر نثر نگار کو آسانی سے دستیاب نہیں ہو سکتی۔ ساقی صاحب کی نثر کی شہرت اپنی جگہ لیکن اس نثر نگاری نے ان کی شاعری کی طرف سے (بڑی حد تک) لوگوں کی توجہ ہٹانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ساقی فاروقی کی انگلینڈ منتقلی سے قبل ہی ان کی ثقافتی تربیت مکمل ہو چکی تھی۔ لہٰذا یورپی طرزِ احساس پوری طرح ان کی غزل کا حصہ نہیں بن پایا۔ وہ یورپ میں رہتے ضرور ہیں مگر ذہنی لحاظ سے وہ آج بھی برصغیر ہی کے باشندے ہیں۔ ساقی غزل کے ساتھ ساتھ نظم کے شہسوار بھی ہیں اور سچ یہ ہے کہ ان کی غزل کی نسبت ان کی نظم کے مطالعہ کے دوران زیادہ وسعت اور تنوع کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کی غزل جدید طرزِ احساس کے مقابلے میں روایت کی روشنی سے جگمگا رہی ہے اور یہ غزل پتھر پر پاؤں مار کر چشمہ نکالنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہاں نہ صرف یاد رہ جانے والے اشعار اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں بلکہ ان کے ہاں ''صراطِ مستقیم'' پر چلنے والی غزل کی بھی کمی نہیں ہے۔ ان کی غزل کے مطالعہ کے دوران یہ خیال بار بار ذہن میں آتا ہے کہ بھرتی کے اشعار والی پھبتی صرف میؔر صاحب ہی پر کیوں کسی جائے۔ یہ ''بیماری'' تو ساقی فاروقی سے لے کر ظفر اقبال تک پھیلی ہوئی ہے۔

ساقی فاروقی تفکر سے تحیر تک کے سفر میں نہ صرف خود عجائبات عالم کو ایک بچے کی سی حیرت سے دیکھتے ہیں بلکہ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اُسے اپنے قاری کو دکھانے کا جتن بھی کرتے ہیں۔ وہ امتناع اور تقدس سے انکاری ہیں اور انہوں نے روح کے دشت اور جسم کے ویرانے کے درمیان توازن تلاش کرنے کی قابل قدر کوششیں بھی کی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل محبس میں تبدیل نہیں ہوتی بلکہ انہوں نے غزل کے ایوان میں بہت سی کھڑکیاں اور روشندان وا کیے ہیں۔ اس غزل کے مطالعے کے دوران قاری کو کئی طرح کی آزادیوں کا احساس ہوتا ہے۔ اس غزل کی سیر کے دوران قاری کا دم نہیں گھٹتا بلکہ اسے تازگی اور آزادی کا احساس ہوتا ہے۔ ساقی فاروقی نے غزل کی آب و ہوا تبدیل کرنے کی قابل قدر کوششیں کی ہیں اور یہ ان کی ایک ایسی عطا ہے کہ نہ صرف ان کے ہمعصر شعراء بلکہ بعد میں آنے والے غزل گو بھی ان کے لگائے ہوئے پیڑوں کے سائے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ ''رازوں بھرا بستہ' غزل ہے شرط' حاجی بابا پانی والا'' اور ''زندہ پانی سچا'' جیسے شعری مجموعے نہیں غزل گوؤں کی اگلی صف میں جگہ عطا کرنے کے لیے کافی ہیں۔

مرے ہمراہ وہی تہمت آزادی ہے
مرا ہر عہد' وہی عہدِ اسیری نکلا

ترے فراق کی قیمت ہمارے پاس نہ تھی
ترے وصال کا سودا ہمارے سر میں رہا

میں کیا بھلا تھا یہ دُنیا اگر کمینی تھی
در کمینگی پہ چوبدار میں بھی تھا

دامن میں آنسوؤں کا ذخیرہ نہ کر ابھی
یہ صبر کا مقام ہے گریہ نہ کر ابھی
وہ مری روح کی اُلجھن کا سبب جانتا تھا
جسم کی پیاس بجھانے پہ بھی راضی نکلا

بخش لائلپوری (انگلینڈ) ''بادشمال' ابھی موسم نہیں بدلا' زندان شہر اور لہو کا خراج'' جیسے شعری مجموعے تخلیق کرنے والا بخش لائلپوری اول و آخر ایک ترقی پسند شاعر ہے۔ ترقی پسند تحریک پر بُرا وقت آنے کے بعد بہت سے شعراء ترقی پسندی سے منحرف ہوگئے' کئی ایک نے معافی نامے بھی داخل کرائے اور درجنوں اہل قلم نئے راستوں پر ہو لیے مگر بخش لائلپوری نے مرتے دم تک عشق اور انقلاب کا رستہ نہیں چھوڑا۔ اس کے دوست بدل گئے' دوستوں کے نظریات میں تبدیلی آ گئی۔ حتیٰ کہ اس کا آبائی شہر لائلپور سے فیصل آباد بن گیا لیکن بخش لائلپوری پھر بھی نہیں بدلہ۔ وہ اپنے خیالات کے ساتھ زندہ رہا اور انہی خیالات کو سینے سے لگائے قبر میں اُتر گیا۔

بخش کی غزل ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باوجود ترقی پسندی کے جبر کا (کسی حد تک) شکار نہیں ہوئی بلکہ اُس نے ہر جگہ اپنی تخلیقی آزادی کا علم بلند کیے رکھا۔ کئی دوسرے ترقی پسند شاعروں کے برعکس اس کی غزل بڑی حد تک لفظ کی میکانکی سطح کو نظرانداز کرتے ہوئے لفظ کی جمال آرائی سے معاملہ کرتی ہے اور لفظ کی آواز اور تصویر سے زیادہ اس کے مفاہیم پر نظر رکھتی ہے۔ آپ اس غزل کو اپنے ماحول اور صورت حال کی سرگزشت کہہ سکتے ہیں۔ بخشلائلپوری بھوک' بیماری' جنگ' افلاس اور بے گھری کی ستائی ہوئی دنیا کو تمام انسانوں کے لیے قابل رہائش بنانے کے خواب دیکھتا ہے یا پھر اس دنیا کو نئے سرے سے تخلیق کرنے کا آرزومند ہے اور یہ خواب تمام ترقی پسند شاعری کا اجتماعی خواب بھی ہے۔ توانا لہجے کے ساتھ ساتھ شدت احساس اور حیرت اظہار اس کی غزل کے نمایاں اوصاف ہیں۔ اگرچہ انگلینڈ منتقل ہونے کے بعد وہ اپنی آبائی سرزمین سے کٹ گیا مگر اس کی تہذیبی و ادبی اقدار سے اس کا رشتہ مزید گہرا ہوگیا۔ بخش کا لہجہ بلند اور احتجاجی ہے اور اس لہجے کو تہہ دار بنانے کے لیے اس نے کوئی شعوری کوشش بھی نہیں کی۔ کیونکہ بہت سے دوسرے ترقی پسند شاعروں کی طرح اس کی توجہ طرز پیش کش سے زیادہ مواد پر مرکوز رہی ہے۔ بخش کی شاعری کو تیسری دُنیا کے پسے ہوئے اور بھوک اور افلاس سے مرتے ہوئے انسانوں کا نوحہ کہہ سکتے ہیں:

دیارِ غیر میں میرا وہ سر پھرا بیٹا
گیا ہے گھر سے تو پھر لوٹ کر نہیں آیا
دردِ ہجرت کے ستائے ہوئے لوگوں سے کہیں
سایۂ در بھی نظر آئے تو گھر لگتا ہے

انجم خیالی (انگلینڈ) احمد مشتاق اور ساقی فاروقی کے بعد مغرب کی اردو غزل کا اہم شاعر ہے۔ غزل گوئی میں وہ بیہودہ راستوں پر اندھوں کی طرح چلنے کی بجائے جادہ سازی کا قائل ہے۔ یہی تخلیقی رویہ اسے دیگر شاعروں سے ممتاز کرتا ہے۔ انجم کی غزل کا مرکزی نکتہ اپنے وجود پر غور وفکر ہے اور وہ اس تکلیف وہ نتیجے پر پہنچا ہے کہ انسان اس عظیم وقدیم کائنات کا مرکز ومحور نہیں

(جبکہ انسان صدیوں سے خود کو آسمانی کتابوں کا مخاطب اور کائنات کا مرکز و محور سمجھتا چلا آ رہا ہے) یہی وہ اذیت ناک سچائی ہے جس نے انسان کی انانیت اور ذہنی دنیا کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا اور انسان کو پھر سے سہارا دینے اور اس کے وجود کی بے معنویت کو ختم کرنے کے لیے وجودیت کا فلسفہ سامنے آیا۔

انجم حریتِ فکر میں یقین رکھتا ہے اس لیے وہ شاہوں کی قصدیہ گوئی کی مذمت کرتا ہے اور صرف امن کے کارکنوں کا قصیدہ گو کہلوانا پسند کرتا ہے۔ اس کی غزل کی امیجری بہت منفرد اور متحرک ہے۔ فطرت' پرندے' آوازیں' پانی' ہوا اور ہرے بھرے اشجار مل کر اس کی شاعری کا تخلیقی ماحول تشکیل دیتے ہیں۔ وہ زخم کی نمائش سے زیادہ زخموں کی پردہ داری میں یقین رکھتا ہے۔ اس کی غزل میں ایک ایسا محبوب سامنے آتا ہے جو رسائی سے باہر ہے۔ انجم کی غزل میں ایک درویشانہ اور جوگیانہ کے لَے ہے جو اسے دُنیا کے اندر رہتے ہوئے دنیا سے لاتعلقی کا ہنر سکھاتی ہے۔ اس نے دنیا کو طلاق تو نہیں دی مگر یہاں دنیا سے نباہ کی کوئی صورت بھی نظر نہیں آئی۔ وہ اس دنیا سے زیادہ متبادل دنیا کا خواب دیکھتا ہے۔

ہر گھر میں اک ایسا کونا ہوتا ہے
جہاں کسی کو چھپ کے رونا ہوتا ہے
اذاں پہ قید نہیں' بندش نماز نہیں
ہمارے پاس تو ہجرت کا جواز نہیں

اشفاق حسین (کینیڈا) شمالی امریکہ میں یوں تو بہت سے شاعر موجود ہیں مگر ان میں شاید ہی کوئی اشفاق حسین سے بہتر غزل گوئی کی صلاحیت رکھتا ہو۔ وہ ایسا شاعر ہے جس نے مغربی معاشرے کی طرف کھلنے والی ذہن کی کھڑکیاں بند کرنے کی بجائے اس نئے طرز احساس کو کھلے دل سے خوش آمدید کہا ہے۔ بیرون ملک آباد بیشتر شعراء کی غزل میں تہذیبی تصادم اہم موضوع کا درجہ رکھتا ہے مگر اشفاق حسین واحد شاعر ہے جس کے ہاں مغربی طرز زندگی کی مزاحمت کرنے کی بجائے اس ماحول کا حصہ بن جانے کی خواہش موجود ہے۔ وہ یورپ و امریکہ میں آباد ہر دوسرے شاعر کی طرح ہجرت کا رونا بھی نہیں روتا اور نہ ہی اس کے دل میں آبائی سرزمین کی طرف واپسی کی آرزو جنم لیتی ہے بلکہ وہ جس سرزمین کے لیے اپنا آبائی وطن چھوڑ کر آیا ہے اس کو اپنے نئے وطن کے طور پر قبول کر لینے کے لیے پُرعزم بھی ہے۔ اشفاق حسین کی غزل میں ہجرت روگ نہیں بنتی بلکہ نئے امکانات کے در وا کرتی نظر آتی ہے۔ وہ اپنے اندر سکڑنے کی بجائے ماحول سے مصافحہ کرنے کا تمنائی ہے۔ اس کی غزل میں انسان دوستی کے ساتھ ساتھ انسانی آزادیوں کا احترام نظر آتا ہے۔ یہ وہ غزل ہے جو روایت اور جدت سے یکساں توانائی حاصل کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس غزل کا روپ پورے امریکہ اُردو غزل سے الگ پہچانا جاسکتا ہے۔ میرے خیال میں اشفاق حسین کی غزل امریکہ' یورپ' مشرق وسطیٰ اور پاک و ہند کی اُردو بستیوں کے درمیان نئے پُل تعمیر کرنے اور انسانی تعلقات کے درمیان نئے رابطوں کی تمنا کا اظہار ہے۔

کام جو عمر رواں کا ہے اسے کرنے دے
مری آنکھوں میں سدا تجھ کو حسیں رہنا ہے

نئی دُنیا نئے منظرؔ نئے افکار ملے
سب شجر نقل مکانی کے ثمردار ملے
نئی زمین پہ کھلاتے رہے شناخت کے پھول
جہاں رہے وہاں اپنی زباں کے ساتھ رہے

افتخار نسیم (امریکہ) نے بیک وقت افسانہ، غزل اور نظم میں خود کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے مگر اس کے تخلیقی اظہار کی بہترین صورتیں نظم اور غزل ہی کی شکل میں سامنے آئی ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر غزل سے زیادہ اس کی نظم نے چونکایا ہے جس کا اسلوب، لہجہ اور مضامین تک میں تازگی کا احساس نمایاں ہے۔''نرمان'' کی نظموں میں افتی نے انسانی وجود کی ایک ایسی تاریک سمت میں دریچہ وا کیا ہے جو اس سے قبل کہی اَن کہی کے درمیان کھلتا تھا۔

نظم کی طرح افتی کی غزل بھی اپنے اندر نئے امکانات رکھتی ہے۔ یہاں موضوعات، ڈکشن، لہجے اور طرزِ احساس کی سطح پر تبدیلیوں کا احساس ہوتا ہے۔ مغرب میں لکھی جا رہی اُردو غزل کے مطالعے کے دوران قاری جس گھٹن کا شکار رہتا ہے افتی کے ہاں آ کر اچانک اسے تازگی اور کھلے پن کا احساس ہوتا ہے۔ افتی کی غزل کا اختصاص یہ ہے کہ اس نے اپنی غزل میں زندگی اور کائنات کے حوالے سے اہم ترین سوالات اٹھائے ہیں۔ اس غزل میں جدید مغربی طرزِ احساس کے ساتھ ساتھ برصغیری زندگی کے نمایاں ترین رنگ میں نظر آتے ہیں۔ اس غزل کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ یہ غزل ایک آسودہ دنیا میں رہ کر بھی اپنے پسماندہ اور پسے ہوئے لوگوں کی خوشیوں، دکھوں اور امیدوں سے صرف نظر نہیں کرتی۔

اس قدر بھی تو نہ جذبات پہ قابو رکھو
تھک گئے ہو تو مرے شانے پر بازو رکھو
اک نئے دور کی بنیاد کو رکھا جائے
دور ماں باپ سے اولاد کو رکھا جائے
شکوہ بے جا تو نہیں دُنیا کے اس کمرے میں
کس طرح مختلف افراد کو رکھا جائے[۸]

عابد ودود (انگلینڈ) کی غزل کا اختصاص یہ ہے کہ یورپ کے درجنوں غزل گو شعراء کی موجودگی میں اس کی غزل یورپ اور برصغیر کے عصری شعور اور معاصر معاشرت کے درمیان خیر سگالی کے لیے نئے پل تعمیر کر رہی ہے۔ جدت اور روایت کے درمیان تخلیقی توازن کس تناسب سے ہونا چاہیے اس سوال کا جواب بھی عابد ودود کی غزل ہمیں فراہم کرتی ہے۔ یورپ کے بیشتر غزل گو شعراء کے برعکس عابد کی غزل تہذیبی تصادم کے مختلف مظاہر کی ترجمانی کی بجائے تہذیب دوستی کا رویہ اختیار کیے ہوئے ہے۔ پشتو سپیکنگ ہونے کے باوجود عابد ودود نہ صرف غزل کا رمز آشنا ہے بلکہ اس نے غزل کو ایک توانا اور مردانہ لہجہ بھی دیا ہے۔ اس کی غزل کا حسن یہ ہے کہ وہ زندگی کے کسی خاص رُخ سے پردہ اٹھانے کی بجائے زندگی کی مکمل تصویر ہمارے سامنے ہوتی ہے۔ یہاں زندگی مشرق و مغرب کے خانوں میں بٹ کر سامنے نہیں آتی بلکہ ایک مکمل زندگی کے طور پر اس سے ملاقات ہوتی ہے اور یہ ایک ایسا تخلیقی رویہ ہے جو مغرب میں آباد بہت ہی کم شعراء کو نصیب ہوا ہے۔

ہر ایک حرف حوالہ مرے دوام کا ہے
مرے قلم میں کسی کی دُعائیں بولتی ہیں
دماغ جاگ رہا ہے، ضمیر زندہ ہے
وفورِ درد میں بھی یہ فقیر زندہ ہے۹

فیضان عارف (انگلینڈ) یورپ وامریکہ میں جو چند نوجوان شعراءغزل گوئی کا سلیقہ رکھتے ہیں فیضان عارف ان میں ایک نمایاں نام ہے۔اس کی غزل میں زندگی کے گہرے تجربوں کا احساس ملتا ہے۔ وہ ارضی زندگی پر جس زاویے سے نگاہ ڈالتا ہے بہت ہی کم شعراء وہاں سے زندگی کو دیکھنے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ کہاں خاموش رہنا ہے اور کہاں اختلاف کرنا ہے۔ اس کے علاوہ کشادہ دلی اور انسان پسندی اس کی غزل کا کینوس وسیع کرتی ہے۔ اسی لیے وہ ہر شاخ کے لیے پھولوں کا تمنائی ہے۔ وہ پرانے شہروں کا نئے نام دینے کی بجائے اقبالؔ کی طرح نئے شہر بسانے کا آرزومند ہے مگر پرانے شہروں کی تزئین پر بھی اصرار کرتا ہے۔ فیضان کی غزل نئے مغربی طرز احساس کے لیے دامن دل وا کرنے کے ساتھ ساتھ قدیم طرز زندگی سے استفادہ کرنے کے سلسلے میں بھی فراخدلی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے شاعری میں جہاں بھی روایت سے رجوع کیا اس کا شعر جگنو کی طرح جگمگا اُٹھتا ہے۔

عارضی رفاقتوں، راکھ کر دینے والی تنہائیوں اور بے وفائی کے رستے پر بھٹکتی محبتوں کے درمیان فیضان سچی اور دیرپا رفاقتوں کا متلاشی ہے مگر محبتوں میں وہ سہاروں کا قائل نہیں۔ وہ خواب سے زیادہ شکست خواب میں زندہ رہتا ہے۔ وہ ان اشجار کو یاد کرتا ہے جن کی جگہ پلازے اُگ آئے ہیں۔ وہ ایسا غزل گو ہے جس پر یورپ کی اردو غزل بجا طور پر فخر کرسکتی ہے۔

جہاں پہ قافلہ سالار تھک کے بیٹھ گئے
وہیں سے اک نیا رستہ نکلنے والا تھا
میں چپ نہیں ہوں کسی مصلحت کے پیشِ نظر
میں جانتا ہوں کہاں اختلاف کرنا ہے

آفتاب حسین (آسٹریا) اسی کی دہائی میں جس قدر شاعر سامنے آئے آفتاب حسین ان میں بہت سے شعراء سے زیادہ تخلیقی ذہن رکھنے والا اور صاحب توفیق شاعر ہے۔ جس شائستگی اور صناعی کے سنگم پر اس کی غزل طلوع ہوتی ہے وہ اس کے معاصرین میں کم کم ہی کو نصیب ہوئی ہے۔ اپنے بیشتر ہمعصروں کی طرح ہر تیز رو کے ساتھ تھوڑی دور تک چلنے کی بجائے اس نے اپنا راستہ خود تلاشا ہے اور یہ ایک ایسا راستہ ہے جسے توارد اور سرقے کے درمیان فرق کو مٹانے پر تلے ہوئے کمرشل شاعر للچائی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ آفتاب حسین نہایت سلیقے سے غزل کہتا ہے اور یہ سلیقہ بھی اسے غزل ہی نے عطا کیا ہے۔ آفتاب نہایت سہولت اور ہنرمندی کے ساتھ غزل کہتا ہے اور اسی سہولت اور ہنرمندی کی وجہ سے ہم اس کی غزل کو اس کے ہمعصروں کی غزل سے الگ پہچان سکتے ہیں۔ آفتاب حسین کا پہلا مجموعہ ''مطلع'' نئی غزل کا ایسا مجموعہ ہے جس پر فخر بھی کیا جاسکتا ہے اور اعتبار بھی۔ اس غزل کا ایک اور کمال یہ ہے کہ یہ جدت اور روایت کی توانائی سے بیک وقت مزین ہے۔ آفتاب

ان دنوں آسٹریا میں مقیم ہے اور ہجرت کے دکھ سہہ رہا ہے۔

فصیل شہر تمنا میں در بنائے ہوئے
یہ کون رل میں در آیا ہے گھر بناتے ہوئے

تمہارے بعد رہا کیا ہے دیکھنے کے لیے
اگرچہ ایک زمانہ ہے دیکھنے کے لیے

اسی طرح کے شب و روز ہیں، وہی دُنیا
پرانی خاک پہ تعمیر ہے نئی دنیٔا

لہو سے میں نے دیے کی لو سرفراز رکھی
وہاں، جہاں پر ہواؤں کا بھی گزر نہیں تھا

مقام شوق سے آگے بھی اک رستہ نکلتا ہے
کہیں کیا سلسلہ دل کا کہاں پر جا نکلتا ہے

اکبر حیدرآبادی (انگلینڈ) یورپ کی اُردو غزل کا ایک اہم نام ہے۔غزل کا المیہ یہ ہے کہ اس کے بیشتر شعراء کے دماغوں کے اکثر گوشے تاریکی میں ڈوبے ہوئے ہیں لیکن اکبر ایسا شاعر ہے جس کا پورا دماغ روشن ہے اور اپنے پورے روشن دماغ کے ساتھ غزل گوئی کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حیات و کائنات کے حوالے سے شاید ہی کوئی اہم سوال ہو جس پر اکبر نے غور وفکر نہیں کیا۔ یہاں تفکر سے لے کر تحیر اور فطرت پسندی سے لے کر جہد البقا تک سب کچھ موجود ہے مگر کیا کیا جائے یہ ساری معلومات تو آپ کو سائنسی کتابوں میں بھی مل جاتی ہیں۔آخر وہ کیا چیز ہے جو عام معلومات کو غزل گری کا ہنر عطا کرتی ہے؟ اکبر کی غزل کے اشعار میں اکثر ایک آنچ کی کمی رہ جاتی ہے اور اس کی غزل معلومات کا پلندہ بن کر رہ جاتی ہے۔

سن تو خرام وقت میں ہیں کتنی آہٹیں
کیا رنگ پر فشاں ہیں غبار ہوا میں دیکھ

ہیں سو طرح کے رنگ ہر اک نقش پا میں دیکھ
انساں کا حسن آئینہ ارتقاء میں دیکھ

ارشد لطیف (انگلینڈ) کی غزل خواب اور حقیقت کے سنگم پر جنم لیتی ہے۔ وہ یورپ میں آباد ان چند شاعروں میں سے ہے جو زندگی اور کائنات کے بارے میں ذاتی تصورات رکھتے ہیں۔ وہ فلسفی کی طرح سوچتا ہے اور شاعر کی طرح اظہار کرتا ہے۔ اس کی غزل زندگی اور کائنات کے حوالے سے اہم ترین سوالوں سے مزین ہے اور میرے نزدیک یہ ایسی آگہی ہے جس سے اردو غزل کا بہت بڑا حصہ ناآشنا ہے۔ ارشد کی غزل ایک ایسی روشنی سے جگمگا رہی ہے جس کا مرکز اس کی ذات سے باہر نہیں بلکہ ذات کے اندر ہے۔ اس کی غزل کا ایک اور امتیاز یہ ہے کہ اس غزل کا تہذیبی پس منظر کوئی مخصوص سرزمین نہیں بلکہ یہاں ارضی و آسمانی حسن کے بیشتر رنگ موجود ہیں۔ اس کی غزل میں نہ صرف ایک سلجھا اور سنبھلا ہوا رویہ سامنے آتا ہے بلکہ

دکھوں کے درمیان زندگی گزارنے کا حوصلہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ ارشد زندگی کو قدرت کی سب سے بڑی نعمت سمجھتا ہے اور زندگی کی مادی حقیقتوں کے حوالے سے تجزیہ وانکشاف کا رویہ اپنائے ہوئے ہے اور یہی دریافت وانکشاف اس کی غزل کا مرکزی رنگ ہے۔ یہاں نیند، خواب اور رتجگے آپس میں گلے ملتے نظر آتے ہیں۔ وہ عجیب عاشق ہے کہ محبوب کے ہمراہ میسر وصال لمحوں میں بھی ہجر کا تمنائی ہے۔ وہ خواب سے زیادہ شکست خواب اور وصال سے زیادہ فراق کا آرزومند ہے۔ ارشد کی غزل میں روحانی اضطراب کے ساتھ ساتھ محبوب سے جسمانی مطالبات بھی سامنے آتے ہیں۔ مگر بنجر ہوتے جسم کی آواز سنتے ہوئے بھی اس غزل کی تہذیبی سطح ہمیشہ قائم رہتی ہے۔

یونہی روشن نہیں ہیں میری آنکھیں
مسلسل آگ دل میں جل رہی ہے
کیسے کیسے وجود روشن میں
وقت کے نیلے شامیانے میں[۱۰]

حمیرا رحمان (امریکہ) مغربی غزل کی خوبصورت شاعرہ ہیں اوران کی غزل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ غزل انسانی رشتوں کی رنگارنگی سے چہک رہی ہے۔ عاشق اور محبوب کے روایتی رشتوں کے علاوہ گھریلو زندگی اور رشتوں کی مہک قاری کو اس غزل کی طرف فوراً متوجہ کرتی ہے۔ حمرا رحمان کی غزل کا اختصاص یہ ہے کہ محبت نہ صرف ان کی طرز زندگی ہے بلکہ یہ محبت ایک کردار کی طرح ہر جگہ موجود رہتی ہے۔ یہ محبت صرف محبوب تک محدود نہیں بلکہ یہ عام انسانوں سے لے کر جانوروں، پودوں اور پرندوں تک ترسیل ہوتی ہے۔ حمیرا کی غزل کا لہجہ بیک وقت امید افزا اور مزاحمتی ہے اور یہ مزاحمت منفی انسانی رویوں سے لے کر مہک ہتھیاروں تک پھیلی ہوئی ہے:

ہزاروں آبنوسی جنگلوں کا حسن کیا معنی
ہمیں جب سانس لینا کیمیائی تجربوں میں ہے

منصور آفاق (انگلینڈ) انگلینڈ کے شعری منظرنامہ کا ایک اہم شاعر ہے۔ قیام پاکستان کے برعکس اس نے انگلینڈ منتقل ہونے کے بعد قدرے بہتر غزل تخلیق کی ہے۔ یہ ایسی غزل ہے جس کے اندر مغربی طرز زندگی کی سچی ترین تصویریں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ''نیند کی نوٹ بک'' میں شامل غزلوں کا لینڈ سکیپ برصغیری سے زیادہ یورپی ہے۔ اس غزل کا ماحول، موسم، پیڑ، پھل پھول، آب وہوا حتیٰ کہ طرزِ احساس تک یورپی ہے۔ منصور کی غزل کا خصوصی امتیاز یہ ہے کہ اس کی غزل نے مغربی زندگی کے نئے ثقافتی مظاہر کو دیگر شعراء کے مقابلے میں سب سے زیادہ فراخدلی سے قبول کیا ہے۔ یورپ کے اردو منظرنامہ کا یہ واحد شاعر ہے جس کی غزل نئے ماحول سے ڈر کر اپنے اندر سمٹنے کی بجائے اپنا سفر باہر کی جانب جاری رکھے ہوئے ہے۔ یہ غزل مصافحے اور مکالمے میں مکمل یقین رکھتی ہے اور مغرب کا محض ''کارگاہ'' کا درجہ دینے کی بجائے اسے واقعی اپنے لیے نئے گھر کے طور پر پہچان چکی ہے۔ ''نیند کی نوٹ بک'' نوٹ بک سے زیادہ غزل کی خودنوشت ہے۔ اس زندگی کی خودنوشت جو غزل کو نیند میں نہیں بلکہ عالم بیداری میں بسر کرنا پڑ رہی ہے:

ایک امید کی کھڑکی سی کھلی رہتی ہے
اپنے کمرے کا کوئی بلب بجھایا نہ کرے[۱۱]
جب میں سطحِ آب پہ چلتا پھرتا ہوں
دیکھ کے لوگ کنارے پر رُک جاتے ہیں

اس مختصر سے مضمون میں اب تک جو غزل گو زیرِ بحث آئے ہیں ان کے علاوہ بھی یورپ و امریکہ کے مختلف ممالک میں غزل گو شعراء کی پوری دُنیا آباد ہے۔ ان میں ایسے بھی ہیں جو شہرِ غزل میں نسبتاً نووارد ہیں اور وہ بھی ہیں جن کے کئی کئی غزلیہ مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ چلتے چلتے چند مزید شعراء کے اشعار دیکھتے چلیے:

سیارگان کی شب میں زمیں سادیا تو ہے
یہ خاک اجنبی سہی رہنے کی جا تو ہے[۱۲]

(افضال نوید۔ کینیڈا)

خواب دیکھے تھے ٹوٹ کر میں نے
ٹوٹ کر خواب دیکھتے ہیں مجھے

(پنہاں انصاری۔ امریکہ)

تحائف کی جنہیں امید تھی وہ منتظر ہیں
مسافر آچکا ہے اب ذرا اسباب اُترے

(آصفہ نشاط۔ امریکہ)

مرے ہونٹوں پہ بکھرا یہ تبسم ڈھال ہے میری
نجانے کب اداسی کا کہیں خنجر نکل آئے

(سلیم فگار۔ انگلینڈ)

یہ گھر در و دیوار کی حد تک ہے سلامت
لیکن وہ جو گھر ٹوٹ گیا ہے مرے دل میں

(ادریس بابر۔ ناروے)

ترے بدن کی طبیعت سے واقفیت ہے
میں جان جاؤں اگر مجھ سے تو چھپانے لگے

(یاسمین حبیب۔ انگلینڈ)

شام کو اُس نے میری خاطر سجنا چھوڑ دیا
میں نے بھی دفتر سے جلدی آنا چھوڑ دیا

(یشب تمنا۔ انگلینڈ)

یاد آتے تھے آشنا چہرے
اور میں اجنبی دیارِ میں تھا

(حفیظ جوہر۔انگلینڈ)

آ گئے ریت کے ڈھیر دیوار تک بلکہ بازار تک
دشت کے ہاتھ لکھ دیں نہ پھر فیصلہ شہر والو سنو

(باقر نقوی۔انگلینڈ)

آدمی کا ہے فسانہ خاک سے
ہے ازل سے دوستانہ خاک سے

(ساحر شوی۔انگلینڈ)

حسن دُنیا کا اگرچہ ہے بہت خوب مگر
دیکھ پایا نہ کبھی گھر کی پریشانی میں[۱۳]

(احمد فقیہ۔سویڈن)

مصر فرعون کی تحویل میں آیا ہوا ہے
خون پانی کی جگہ نیل میں آیا ہوا ہے

صباحت عاصم واسطی۔انگلینڈ)

پرندے ہم کو پیڑوں پر دکھائی کیوں نہیں دیتے
کسی بھی شاخ پر اب گھر دکھائی کیوں نہیں دیتے

(گلشن کھنہ۔انگلینڈ)

نہ خطرہ تیرگی کا تھا نہ خطرہ تیرگی کا ہے
در و دیوار پر پہرہ ابھی تک روشنی کا ہے

(رفیع الدین راز۔کینیڈا)

کب دل کے زخم چارہ گروں سے رفو ہوئے
جو ہاتھ دل کی سمت بڑھے سب لہو ہوئے

(عرفانہ عزیز۔کینیڈا)

کھل ہی جائے گا کوئی باب ایجابت سجاد
اپنے ہاتھوں کو بہر طور اٹھائے رکھو

(سجاد حیدر۔جرمنی)

رنجشوں کے درمیاں ہوتے ہوئے
ہم یہاں کب ہیں، یہاں ہوتے ہوئے

(سعید۔ آسٹریلیا)

بیرون برصغیر اُردو غزل کا یہی وہ منظر نامہ ہے جس کے کنارے کھڑے ہو کر ہم اُردو غزل کے ظاہر و باطن میں جھانک سکتے ہیں۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ غزل کے اسی منظر نامے کے بیچوں بیچ شاعری کا ایک جعلی ادبی منظر نامہ بھی ہے جس سے وابستہ ''ادبی بہروپیے'' ادیبوں سے بھی زیادہ ادیب نظر آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شاید ادب سے وابستہ اثر و رسوخ، مفادات اور شہرت کی خواہش انہیں اس کوچے کی طرف لے آئی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ڈالروں کے عوض پہلے سے تیار شدہ مسودے خرید کر راتوں رات ادیب شاعر بن بیٹھے ہیں۔۱۴ بقول ڈاکٹر سلیم اختر ان دو نمبر شاعروں کا ہمارے ان شاعروں سے گٹھ جوڑ ہو چکا ہے جو بیرونی ممالک کی سیاحت اور مشاعرے پڑھنے کے خواہشمند ہیں۔ ۱۵ انڈین ادیب سنجے گوڈ بولے اور کشن مہیشوری اسے سرعام ادبی بدکاری قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس عمل سے ایک طرف حقیقی ادیبوں، شاعروں کی حق تلفی ہو رہی ہے اور دوسری طرف ادب کو جعل سازی کا گودام بنایا جا رہا ہے۔ ۱۶ منیر جہاں ایسی شاعری کو پیراسائٹک شاعری کا نام دیتی ہیں جس میں کلام کسی کا ہوتا ہے اور نام کسی اور کا۔ ۱۷ بہرحال ایک بات تو طے ہے کہ یہ ادبی سمگلنگ انڈو پاک ہی سے ہو رہی ہے اور ہمارے بعض شاعروں کی ان غیر ادبی سرگرمیوں نے بیرون ملک اردو شعری منظر نامے کے حوالے سے سوالیہ نشان کھڑے کر دیے ہیں۔

میرے نزدیک وہ تمام شعراء قابل قدر ہیں جو مختلف ثقافتوں میں آباد ہو جانے کے باوجود اردو زبان اور اپنی آبائی ثقافتوں کی گٹھڑیاں سروں پر اٹھائے بنجر زمینوں پر چل رہے ہیں اور انہوں نے بیرون ملک غزل کا علم بلند کر رکھا ہے لیکن ادب کی دُنیا میں صرف زبان و ادب سے محبت کی بنیاد پر کوئی ناقابل فراموش کارنامہ سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ شاعر غزل کی تاریخ، اس کی روایت، غزل کی مختلف ڈکشنز، غزل کے مختلف لہجوں، غزل کے موضوعات، غزل کی طرزِ پیشکش، غزل کی اندرونی آب و ہوا، مختلف ادوار میں غزل کے حوالے سے ہونے والی مخالفت، عہد بہ عہد غزل میں ہونے والی تبدیلیوں اور مختلف ادوار میں غزل گو شعراء کی طرف سے غزل میں کیے جانے والے تخلیقی اضافوں کی تاریخ پر بھی گہری نظر رکھتا ہو۔ یورپ و امریکہ کی اُردو غزل پر اس حوالے سے نظر ڈالی جائے تو بیشتر غزل گو اس معیار پر پورا نہیں اُترتے۔

بیرون ملک اُردو غزل کا المیہ یہ ہے اس خطے میں غزل کو اجتہادی ذہن رکھنے والا ایک بھی ایسا شاعر میسر نہیں آ سکا جو غزل کی ''جُگالی'' کی کیفیت سے باہر لائے اور اس کی غزل، تارکین وطن کو درپیش صورت حال سے بڑے پیمانے پر معاملہ کرے۔ دونوں تہذیبوں کی آویزش اور اختلاط کے نتیجے میں جو تجربات سامنے آئے ہیں انہی فنی مہارت اور تخلیقی ذہانت کے ساتھ فن کا حصہ بنائے۔ یعنی ایک ایسا غزل گو جو مغرب کی اُردو غزل کو اندر سے روشن کر دے اور اس کی بوسیدہ رگوں میں نیا خون دوڑائے۔ آج مغرب کی اُردو غزل کسی ایسے ہی مسیحا کی منتظر ہے جو اس کے تن نیم جاں کو چھو کر حرف قم باذن اللہ کہے۔

حواشی:

۱۔ انجم رومانی (اداریہ) مشمولہ ''اقدار'' شمارہ نمبر ۲۰۔۱۹' کراچی' ص: ۸

۲۔ جاوید انور ''اشکوں میں دھنک'' لاہور: الحمد پبلی کیشنز' ۱۹۹۴ء' ص: ۷۵

۳۔ راشد امین ''ماچس'' راولپنڈی: حرف اکادمی' ۲۰۱۰ء' ص: ۴۴

۴۔ احتشام حسین' ''جسید ادب کا تنہا آدمی نئے معاشرے کے ویرانے میں'' مشمولہ'' سہ ماہی شہزاد' شمارہ نمبر ۲' ۲۰۰۱ء' لندن' ص: ۱۸

۵۔ جواز جعفری' ڈاکٹر' ''اُردو ادب یورپ اور امریکہ میں'' لاہور: مکتبہ عالیہ' ۲۰۰۸' ص: ۲۰۷۴

۶۔ جواز جعفری' ڈاکٹر' ''اُردو غزل کا مغربی دریچہ'' لاہور: کتاب سرائے پبلیشرز' ۲۰۱۱' ص: ۲۳

۷۔ ساقی فاروقی' ''زندہ پانی سچا'' لاہور: سنگ میل پبلشرز' ۱۹۹۲ء' ص: ۱۹۴

۸۔ افتخار نسیم' ''آب دوز'' فیصل آباد: ہم خیال پبلشرز' ۲۰۰۳ء' ص: ۱۵۵

۹۔ عابد ودود' ''کڑی دھوپ کا مسافر'' راولپنڈی: حرف اکادمی' ۲۰۰۳ء' ص: ۴۳

۱۰۔ ارشد لطیف' ''چشمۂ خواب سے'' لاہور: الحمد پبلیکیشنز' ۲۰۰۰ء' ص: ۱۰۶

۱۱۔ منصور آفاق' ''نیند کی نوٹ بک'' لاہور: اساطیر' ۲۰۰۴ء' ص: ۱۱۷

۱۲۔ افضال نوید' ''تیرے شہر وصال میں'' لاہور: پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز' ۱۹۹۳ء' ص: ۲۱

۱۳۔ احمد فقیہہ' ''حرف انکار'' لاہور: الحمد پبلیکیشنز' ۲۰۱۱ء' ص: ۱۴۰

۱۴۔ ارشاد ہاشمی' مشمولہ' ''ادبی دُنیا'' شمارہ نمبر ۱' ۲۰۰۲ء' جرمنی' ص: ۳

۱۵۔ سلطانہ مہر' ''گفتنی'' امریکہ: مہر بک فاؤنڈیشن' ۲۰۰۱ء' ص: ۳۱۹

۱۶۔ حیدر قریشی' مشمولہ' ''جدید ادب'' شمارہ جولائی تا دسمبر' ۲۰۰۳ء جرمنی' ص: ۳۶

۱۷۔ گوپی چند نارنگ' ڈاکٹر' ''اُردو کی نئی بستیاں'' لاہور: سنگ میل پبلشرز' ۲۰۰۸ء' ص: ۹